ادب، مزاحمت اور انقلاب

ڈاکٹر ناہید قمر

Abstract:

Literature, as an art form, is affected not only by external determinants but by a dynamism within art itself that promotes or impedes change. This dynamism emerges from resistance as literatures, for being the reflection of society, has to, willingly or otherwise, stand against the existential basis of dominant pereeptions, narratives, discourses or idealogies of its time. Resistance takes many forms and employs diverse style and manners in literature, therefore literary resistance is more subtle and intellectually far more impactful. As one can see through the history of mankind, the struggles for national liberation and independence have not only sought socio economic control and cultural domination but have also produced a significant corpus of literary writing, both narrative and poetic, as well as a broad spectrum of theoratical analysis of the political, ideological and cultural parameters of this struggle. This article analysis the role of literature. In the power politics of modern world, as in terms of literature, resistance is defined as struggle for survival, liberty and change.

ادب میں کسی تخلیق کے معنی اس تجربے سے متعین ہوتے ہیں جو اس کی بنیاد بنتا ہے یا اُس کا حاصل، امن، انصاف اور سچائی کی طرح آزادی بھی ایک ایسی قدر ہے جس سے افراد اور قومیں سرفروشی کا قرینہ اور عزت سے جینا سیکھتی ہیں۔ آزادی نسلِ انسانی کا مشترک ورثہ ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ اقوامِ عالم کے لیے آزادی کے خدوخال صدیوں کی جدوجہد اور مزاحمت کے بعد ہی واضح ہوتے ہیں۔ اسی باعث آزادی اور انقلاب کی صحیح قدر و قیمت کا ادراک ان اقوام کو ہوتا ہے جو غلامی کے جہنم سے گزر چکی ہوں۔

تاریخ شاہد ہے کہ یورپی اقوام کی ترقی اور بیداری جہاں ایک طرف روشن خیالی اور سائنسی معراج کی نوید لے کر آئی وہیں دوسری جانب انسانی غلامی اور جبر و استحصال کا پیغام بھی ثابت ہوئی۔ مغرب نے تاریک دور سے باہر نکلتے ہی پہلی دنیا کو تیسری دنیا میں تبدیل کر کے اسے تاریک دور میں دھکیل دیا۔ پندرھویں صدی کے نصف آخر تک برطانیہ، فرانس،

پرتگال اور سپین نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک کو توسیع پسندانہ عزائم کے تحت اپنی نوآبادی بنالیا تھا، اور استحصال کا یہ سلسلہ بیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ کسی نہ کسی حوالے سے آج اکیسویں صدی میں بھی فلسطین، کشمیر، عراق اور افغانستان کے عوام حقیقی آزادی کے تصور سے دور رہیں۔

جبر اور نااُمیدی کے اس طویل دور میں جس نے دلوں میں آس اور جدوجہد کی شمع روشن رکھی اسے معاشرہ ادیب اور شاعر کے نام سے پکارتا ہے۔ شاعر اور ادیب پر حقائق سے گریز کا الزام بھی لگایا گیا لیکن وقت نے ثابت کیا کہ وہ نہ صرف لمحہ موجود سے باخبر ہوتا ہے بلکہ اسے پردہ افلاک میں مستور حوادث کا بھی بخوبی ادراک ہوتا ہے۔ جب سامراجیت نے پنجے گاڑے تو محکوم اقوام کے شعراء نے صحیح معنوں میں دیدہ بینائے قوم ہونے کا ثبوت دیا۔ تاریخ انسانی میں بہت سے شعراء نے آزادی کی تحریکوں میں عملی جدوجہد کی اور متعدد نے اس راستے پر اپنی جانیں بھی قربان کیں۔ ہنگری کے شاعر سیندور پتوفی نے ہنگری کی جنگِ آزادی میں اپنی نظموں کے ذریعے آواز اُٹھائی اور جنگ میں عملی طور پر شریک ہو کر اپنی جان بھی قربان کر دی۔ مارٹن لوتھر کنگ سیاہ فاموں کے لیے جدوجہد کرتا رہا اور بالآخر سفید فاموں کے ہاتھوں ۱۹۶۸ء میں مارا گیا۔ کیوبا نے سپین کے خلاف دوسری جنگِ آزادی شاعر جوزف مارٹی کی قیادت میں لڑی اور ۱۸۹۸ء میں سپین سے آزادی حاصل کر لی۔ ۱۹۵۹ء میں جب فیڈل کاسترو نے کٹھ پتلی حکمرانوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑی تو چی گویرا نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ چی گویرا نے کیوبا کے بعد بولیویا کے محکوم عوام کی مدد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ سپین کی جمہوریت اور آزادی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں سپین کا مشہور شاعر گارشیا لورکا اور برطانیہ کا نوجوان شاعر ڈیوڈ گیٹ بھی شامل ہیں۔ لاطینی امریکہ کے کئی شعراء جمہوریت اور آزادی کی جدوجہد میں جلاوطنی اور قید و بند کا شکار ہوئے۔ جنوبی افریقہ کا معروف شاعر بنجمن مولوئس بھی حریتِ فکر کی خاطر تختہ دار پر جھول گیا۔ ایران کے فرخی یزدی کے ہونٹ سیے گئے تو محمد رضا عشقی کو آمریت کی مخالفت کی پاداش میں قتل کروا دیا گیا۔ ترکی کے ناظم حکمت کو ۳۵ سال قید کی سزا سنائی گئی، پھر بعد ازاں عالمی دباؤ کے تحت سرکاری طور پر عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ سارتر نے الجزائر کے عوام کے حق میں اپنی حکومت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ الجزائر کے مسئلے پر فرانس کے ۱۲۱ ادیبوں نے تحریک چلائی کہ فرانسیسی نوجوان فوجی خدمات سرانجام نہ دیں۔ (۱) برطانیہ کے نوبل انعام یافتہ ادیب برٹرینڈ رسل نے ویت نام کے جنگی جرائم اور امریکی سامراج کی حمایت پر برطانوی پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کی۔

عالمی ادب کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب بھی انسان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے۔ دنیا کے انسان دوست اور روشن ضمیر ادیبوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ خواہ وہ رومین رولاں ہوں، آندرے مالرو ہو یا گارشیا لورکا، سارتر ہو یا ناظم حکمت، اقبال ہوں یا فیض احمد فیض، ہر دور اور ہر ملک کی تاریخ ادب میں مزاحمتی فکر کی سینکڑوں مثالیں

موجود ہیں اور ہر ادیب نے اپنے اپنے عہد میں کسی نہ کسی طرح کی سماجی وابستگی ضرور رکھی ہے۔ ادیب کو اپنے عہد کا ضمیر اور اپنے معاشرے کی آواز کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے عہد کا سب سے حساس اور ذہین محتسب ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کے دورِ غلامی میں شعراء نے اپنی جادو بیانی سے جذبہ آزادی کو تقویت پہنچائی، نتیجتاً لوگ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ہر آزمائش سے گزرے لیکن اپنی آزادی سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔ دنیا کے بہت سے انقلابات کا فکری شناس نامہ ادب نے ترتیب دیا ہے۔ جرمنی، فرانس، ترکی، مصر، ایران، امریکہ اور روس کے انقلابات میں ادب کا اہم کردار رہا ہے۔ اگر ہم انقلابِ فرانس کا مطالعہ کریں تو سارتر کے اس قول کی تصدیق ہوتی نظر آتی ہے کہ ادیب کا قلم اس کا ہتھیار ہے۔ یہ اسی ہتھیار کی طاقت کا اعتراف تھا کہ انقلابِ فرانس کے بعد جب شہنشاہ لوئی کو محل سے کھینچ کر گلیوٹین سے ذبح کرنے کے لیے لایا گیا تو اس نے برملا کہا کہ انقلابِ فرانس کچھ نہیں ہے سوائے والٹیر اور روسو کے۔ انقلابِ روس سے پہلے کا منظر نامہ دیکھیں تو پشکن، الیگزنڈر بلاک اور مایا کوفسکی حریتِ فکر کی نمائندگی کرنے والے شعراء میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انقلابِ روس نے اُردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے جس کی بازگشت اقبال، حسرت، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، حبیب جالب، فیض احمد فیض اور ظہیر کاشمیری وغیرہ کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ استحصال کے خاتمے اور ایک فلاحی ریاست کے قیام کے لیے ادیبوں اور شاعروں نے انقلابِ روس کی حمایت ضرور کی لیکن جب سوویت یونین میں انسانوں کو اظہار و عمل کی آزادی سے محروم کیا گیا تو اس کے خلاف بھی ادیبوں نے ہی آواز بلند کی۔

بورس پاسترناک، انا احموتووا، یوتے شنکو اور وازینکی وغیرہ نے کمیونزم کے نظریے کا حامی ہونے کے باوجود حکومت کے ظلم اور زباں بندی کے خلاف لکھا۔

انقلاب ایران بیسویں صدی صدی کی اسلامی دنیا میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مشروطیت کی تحریک سے انقلاب تک ایک صدی کی جدوجہد کے دوران ایران کے ادیبوں اور شاعروں نے مثالی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ملک الشعرا بہار، عارف قزوینی، فرخی یزدی، محمد رضا عشقی، کریم پور شیرازی، مرتضٰی کیوان، حمد بہرنگی، جلال الاحمد، احمد شاملو اور پروین اعتصامی جیسے ان گنت شعرا ہیں جن کی جرأت مندی نے انقلابِ ایران کا راستہ ہموار کیا۔ اس انقلاب نے پاکستانی معاشرے اور ادب پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ فیض احمد فیض نے اپنی نظم ''ایرانی طلبہ کے نام'' میں امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آنے والے طلبہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

''یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی

بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم (۲)

اقبال تو تہران کو عالمِ مشرق کا جنیوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ انقلابِ ایران کے ضمن میں اقبال کی فکری رہنمائی کا اہل ایران اور مفکر انقلابِ ایران ڈاکٹر علی شریعتی برملا اعتراف کرتے ہیں۔

انقلاب چین کے موقع پر چین کے شاعر رہنما ماؤزے تنگ نے ایک ہی تاریخی جملہ کہا تھا کہ چینی عوام اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں" لیکن اس مختصر سے جملے کے پیچھے جدوجہد کی ایک پوری داستان ہے۔ خود شاعرِ مشرق نے گراں خواب چینیوں کے سنبھلنے کا اشارہ اپنے کلام میں دے دیا تھا۔ چین کے انقلاب کے پس منظر میں بھی چین کے دانشور شعراء کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لوشون، کو مورو، اے چھنگ، ماؤدون، لاؤشے اور چولی بو سمیت بیسوں شعراء، اور ادیبوں نے ادب کو چینی قوم کی آزادی کا علمبردار بنائے رکھا۔ اُردو ادب میں علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، ابنِ انشا اور عبدالعزیز خالد وغیرہ نے انقلاب چین کو تیسری دنیا کی اُمید قرار دیا ہے۔ یحییٰ امجد، ابنِ انشاء اور کشور ناہید جیسے اہم مترجمین نے ترجموں کے توسط سے بھی اُردو دنیا کو متعدد ایم چینی شعرا سے متعارف کروایا ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہونے کے باوصف فلسطین دنیائے اسلام کی محبتوں کا مرکز ہے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں بالفور ڈیکلریشن کے نتیجے میں برطانوی جنرل ایلن بی بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے کہا تھا کہ آج صلیبی جنگیں ختم ہو گئی ہیں لیکن درحقیقت یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ نہ صرف سرحدوں پر بلکہ ادبی محاذوں پر بھی۔ ۱۹۱۷ء سے تاحال فلسطینی شعراء میں ابراہیم طوقان، رشید سلیم الخوری، محمد علی الحومانی، امین ناصر الدین، عبدالرحیم محمود، فدوٰی طوفان، توفیق زیاد، سمیع القاسم، محمود درویش، سلمیٰ الخضر، جبرا ابراہیم جبرا، کمال ناصر، توفیق صائغ اور لیلی خالد سمیت بیسوں شعراء نے تحریکِ آزادی فلسطین کو اپنی شاعری کا محور مرکز بنائے رکھا۔ محمود درویش کو تو فلسطین کے قومی شاعر کی حیثیت حاصل رہی اور درویش کی نظموں نے عربی شاعری کو مزاحمت کی آواز بنا دیا۔

"ہمارے حاکمو، کم ظرفو!
تم نے ہماری سرزمین کو قبرستان میں بدل دیا ہے

تم نے ہمارے سروں میں گولیاں بوئی ہیں
اور خون ریزی کو نظریہ بنایا ہے
ہمارے حاکمو!
کوئی عمل اپنے احتساب کے بغیر مکمل نہیں
تم نے جو کچھ میرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے
اس کا احتساب ہو گا
بھولنے کا امکان ہی نہیں
وہ سب تاریخ کے ماتھے پر رقم ہے"

نظم (ہمارے حاکمو۔ محمود درویش) (۳)

عراق سے نازک الملائکہ اور شام سے نزار قبانی سمیت عرب دنیا کے بیسیوں شعراء نے بھی فلسطینی شعراء کی آواز میں اپنی آواز ملائی۔اُردو کے بھی تقریباً تمام شعراء نے اپنی شاعری میں فلسطین سے اپنی محبت اور یگانگت کا ثبوت دیا ہے۔اس ضمن میں اوّلیت اقبال کو حاصل ہے۔وہ فلسطین کی حمایت میں منعقد ہونے والے احتجاجی جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی تحریروں میں بھی مسئلہ فلسطین کی اہمیت اُجاگر کرتے رہے۔فیض احمد فیض کی شاعری میں مسئلہ فلسطین ایک جذباتی تعلق کی صورت میں سامنے آتا ہے جو فلسطین میں اُن کے قیام اور یاسر عرفات اور محمود درویش سے ان کی قلبی وابستگی کا غماز ہے۔علاوہ ازیں مولانا ظفر علی خان، احمد ندیم قاسمی، یوسف ظفر، ظہیر کاشمیری حبیب جالب، ابنِ انشاء، رئیس امروہوی، شورش کاشمیری، ضمیر جعفری، عبدالعزیز خالد، احمد فراز، خاطر غزنوی، شہزاد احمد اور کشور ناہید سمیت متعدد شعراء نے فلسطینیوں کی مہاجرت، اسرائیلی مظالم، انسانی حقوق کی پامالی، عالمی طاقتیں کی بے حسی، مسلم اُمہ کی مجرمانہ غفلت اور فلسطینیوں کی بے مثال جدوجہد کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔اس ضمن میں تراجم کا بھی اہم کردار رہا ہے۔اُردو میں محمد کاظم، امجد اسلام امجد، شاہین مفتی، منو بھائی، کشور ناہید، ضمیر احمد، انور زاہدی، آصف فرخی، منیر الدین احمد اور تنویر انجم وغیرہ نے تراجم کے ذریعے مسئلہ فلسطین کو اُردو قارئین تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں برپا ہونے والی آزادی کی تحاریک کے علاوہ مذہبی و ملی وابستگی کے سبب تحریکِ آزادی کشمیر خصوصی طور پر مسلمانانِ پاکستان اور اس کے ادیبوں کے لیے ایک جذباتی موضوع رہا ہے علامہ اقبال کے یہاں آغاز سے آخری درد تک خطہء کشمیر سے گہری دلچسپی اور محبت موجزن ہے۔پیام مشرق ہو، جاوید نامہ ہو یا ارمغانِ حجاز، کشمیر ہر جگہ موجود ہے۔ظفر علی خان نے "زمیندار" کے ذریعے تحریکِ کشمیر کو زندہ و توانا رکھا۔زمیندار کے شہید نمبر، اسلام نمبر اور کشمیر نمبر ضبط ہوتے رہے لیکن ظفر علی خان نے اپنے موقف کا اظہار جاری رکھا۔حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی

،یوسف ظفر، شورش کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر، احمد فراز، عبدالعزیز خالد، حبیب جالب، نعیم صدیقی، طفیل ہوشیارپوری، امجد اسلام امجد اور افتخار عارف سمیت بیسیوں شعراء کی تخلیقات مسئلہ کشمیر کو اپنا موضوع سخن بناتی ہیں۔ خود کشمیری شعراء میں محمد دین فوق، ملا طاہر غنی، حبہ خاتون، عبدالاحد آزاد اور غلام احمد مہجور وغیرہ کے یہاں تحریکِ آزادی کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے اختتام تک تقریباً پورا براعظم افریقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن بیسیوں صدی کے اواخر تک افریقہ آزادی سے ہم کنار ہو چکا تھا۔ افریقہ کو حیاتِ نو بخشنے میں نیگرو شاعری نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ رضی عابدی نے استعماری نظام کی شکست وریخت میں افریقی شاعری کے کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف عظیم جدوجہد میں افریقہ کی شاعری ایک نئی توانائی اور زندہ جذبے کی علامت بن کر اُبھری ہے۔(۴)

دراصل افریقی شاعری نے سیاہ فامی کو ہی اپنے افتخار اور شناخت میں تبدیل کر لیا، یوں افریقی تہذیب کی توانائی کھل کر سامنے آئی اور نیلسن منڈیلا کی قوم سر اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ افریقی قوم کو عزت و وقار سے سرفراز کرنے والے ادیبوں میں برناڈاڈاڈی ڈیوڈ ڈیوپ، بنجمن مولوئس، ڈینس بروئیس اور بیری فین برگ سمیت متعدد شعرا شامل ہیں۔ اُردو شعرا نے افریقہ کی تحریکِ آزادی سے متعلق اہم شعری تراجم کو قارئین تک پہنچایا اور براہِ راست بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مترجمین میں احمد فراز، رضی عابدی، منو بھائی، شمیم حنفی، اصغر ندیم سید، کشور ناہید، شہزاد احمد انیس ناگی اور مشرف عالم ذوقی کے نام نمایاں ہیں جبکہ براہِ راست اظہار خیال کرنے والے ادیبوں میں اقبال، فیض، راشد، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، آفتاب اقبال شمیم، جاوید شاہین، کشور ناہید، ظہیر کاشمیری، شکیب جلالی، شہزاد احمد، ابنِ انشاء، نعیم صدیقی اور جیلانی کامران قابلِ ذکر ہیں۔

عالمی تناظر میں آزادی اور انقلاب کی تحاریک مزاحمت میں ادب کے کردار کے جائزے کے بعد اُردو ادب پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں مزاحمتی فکر کی ایک قابلِ ذکر روایت موجود ہے۔ اُنیسویں صدی سے قبل جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی، سودا اور قائم وغیرہ کے یہاں استحصال کے خلاف ایک موثر احتجاج موجود ہے۔ جبکہ بیسویں صدی ہمارے ہاں بے شک مذہب، تعلیم، معاشرت اور زندگی کے بدلتے ہوئے اسالیب کے سیاق میں سرگرم اصطلاحات کی صدی تھی، لیکن اس کے پیچھے عہد وسطی کی عظیم الشان مغلیہ تہذیب کا سایا تھا۔ گویا کہ عقلیت اور روشن خیالی کی جس روایت کا آغاز اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے ہندوستان میں ہوا ہے اسے صرف مغلوں کے زوال اور مغربی اقتدار کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ مغربی تمدن کی نمود ہمارے یہاں اس تہذیب کے پسِ منظر میں ہوئی جو مغلوں کی سیاسی

شکست کے باعث اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے سے قاصر تھی۔ یہ انسانی شکست وریخت کے احساس سے پُر ایک مشکل زمانہ تھا جس میں حسی اور مادی زندگی کے دو مختلف اور باہم متصادم اسالیب نے اُس زمانے میں ان لوگوں کے لیے بہت دشواری پیدا کر دی تھی جو نہ تو اپنے روحانی وجود سے دستبردار ہو سکتے تھے نہ گردو پیش کی حقیقتوں سے لاتعلق رہ سکتے تھے۔ قدروں کی آویزش اور تصادم کے اس دور میں مسلمانوں کا وقار جو قائم رہا تو اس لیے کہ اچھے ادب کی تخلیق کا سلسلہ بہر حال جاری رہا۔ اُنیسویں صدی کے حالات کو برطانوی تسلط کے باوجود جس چیز نے سنبھالے رکھا وہ غالب، سر سیّد اور ان کے معاصرین سے قطع نظر ایک تھکے ہوئے معاشرے پر، اس معاشرے میں پیدا ہونے والے عالموں، فنکاروں اور ہنر مندوں کے اثر انداز ہونے کی طاقت تھی۔ وہ معاشرہ اپنی ابتری کے باوجود اپنی علمی و تہذیبی روایت کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا۔

ہماری دانشوری کی وہ روایت جو سر سیّد اور اقبال سے ہوتی ہوئی ہمارے دور تک پہنچی اور جس نے مغرب کو سمجھنے کے بعد ایک نئی مشرقیت اور ایک نئے قومی تشخص کے آثار مرتب کیے، اس کا نقطہ آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہے جس کی تہہ سے اُردو معاشرے میں ایک نئی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا تھا۔ سر سیّد اور ان کے معاصرین کے لیے اجتماعی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑے فیصلے کی گھڑی تھی، چنانچہ وہ اپنی تمام تر کشمکش اور روحانی خلش کے باوجود نئی بیداری کے اس فیصلے پر ثابت قدم رہے۔ ان کے تہذیبی شعور کی تہ میں اس وقت جو انسانی مطالبات کام کر رہے تھے، ان سے انکار کا مطلب شاید اپنی انسانیت کی نفی کے سوا کچھ اور نہ ہوتا۔ تاریخ کے اس دوراہے پہ ان اصحاب نے جس راستے کا انتخاب کیا وہ شاید ناگزیر تھا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ غالب اور سر سید سے لے کر آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد تک ان سب کے احساسات کی مشرقیت افکار و اقدار کے نئے اسالیب اختیار کرنے کے بعد بھی بہر حال باقی رہی۔ اور بالآخر اسی کی تہہ سے دانشوری کی اس روایت کا ظہور بھی ہوا جس کی ترقی یافتہ شکل ہمیں اقبال کے یہاں نظر آتی ہے۔ سر سید اور ان کے رفقاء کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات نے ہندی مسلمانوں کی اجتماعی شخصیت کی تباہی اور انتشار پر نوحہ خوانی کے بجائے اس شکست خوردہ انبوہ کو نفسا نفسی کے گرداب سے نکال کر قومی استحکام کے راستے پر گامزن کیا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور مورخوں نے جہاں ہمیں بے چارگی اور بے عملی کی کیفیت سے نجات دلا کر سمت اور شعور عطا کیا وہاں ہمہ گیر معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی مقاصد پر مبنی نئی فنی اور جمالیاتی اقدار بھی تخلیق کیں۔ زندگی اور ادب کی ان توانا اور متحرک اقدار سے تخلیقی وابستگی نے رفتہ رفتہ ہمارے دانشوروں کو تحریکِ آزادی کا دل و دماغ بنا دیا۔

بیسویں صدی ادبی اور فکری اعتبار سے اقبال کی صدی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قومیت کے جدید تصورات کی تشکیل کی اور مسلمانوں کے روحانی و فکری امراض کی نشاندہی کر کے ان کا حل بھی دریافت کیا۔ غلامی کی ذلت، آزادی کی قدر و قیمت، اتحاد کی اہمیت، فرقہ واریت کی زیاں کاریاں، جہد و عمل کی برکات، رجائیت کے ثمرات اور

سامراج کی سازشیں۔ کون سا رنگ ہے جو اقبال کے یہاں موجود نہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا اہم پہلو اس میں جاگزیں قومی انا کا احساس ہے۔ اقبال سے پہلے اس احساس کی کچھ روشنی اکبر اور حالی کے کلام میں بھی ملتی ہے لیکن اکبر کے یہاں مغرب کی تعبیر و تنقید میں اور حالی کے یہاں خود اپنی روایت کے جائزے اور محاسبے میں جذباتی غلو کا رویہ عام ہے۔ شمیم حنفی اقبال کے حوالے سے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''مغرب اقبال کے لیے ایک سامراجی طاقت کے بجائے دراصل ایک تہذیبی اقتدار اور استحصال کی علامت تھا۔ مشرقی اقوام میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجیکل ترقی پر مبنی تہذیب سے مرعوبیت بلکہ خوف زدگی کا جو رجحان پنپ رہا تھا، اپنی نظم و نثر کے ذریعے اقبال نے پورے مشرق کو اس سے بچانے کی کوشش کی۔ اقبال کے یہاں، اسی لیے آزادی کا جو تصور ملتا ہے اس کی اساس دراصل تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ہے۔'' (۵)

۱۸۵۷ء سے لے کر ترقی پسند تحریک کے آغاز تک اقبال کے ساتھ ساتھ چند اور اہم شعراء جن کی حریت فکر کے باعث 'فرنگ' کا لفظ ایک مرتبہ پھر استعمار کی استبدادی طاقت کی نفرت انگیز علامت بنا، ان میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خان اور جوش ملیح آبادی شامل ہیں۔ بعد ازاں ہندوستان سے برطانوی حکومت کے خاتمے اور حصولِ آزادی کی تگ و دو میں ترقی پسند تحریک کے شعراء نے عوامی جذبات کی نمائندگی کی۔ اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، علی سردار، جعفری، جانثار اختر، مخدوم محیی الدین، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور مجروح سلطان پوری کی شاعری نے اجتماعی احساس و شعور کو مقصدیت سے روشن تر کرتے ہوئے جذبہ آزادی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ شان الحق حنفی نے بجا طور پر کہا ہے کہ ہماری شاعری کے سر ایک عرصے تک یہ الزام رہا ہے کہ اس میں صرف گل و بلبل کی داستانیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس نے قومی زندگی کے ہر مرحلے پر اور ہر موڑ پر نہ صرف زندگی کا ساتھ دیا بلکہ اسے آگے بڑھایا اور اپنی رجز خوانی سے رفتارِ کارواں کو تیز کیا۔ شاید دنیا کی کسی اور زبان میں اتنا بڑا ذخیرہ ایسی شاعری کا موجود ہو جو قومی جوش و خروش، حریت پسندی کے جذبات اور سیاسی شور سے اس حد تک مملو ہو (۶)

ادب تاریخ کا فٹ نوٹ نہیں ہوتا لیکن ہمارے ادب پر سیاسی حالات کا پرتو اتنا واضح ہے کہ ادب کی حیثیت تاریخ کے متبادل بیانیے کی ہو گئی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حریت پسندی اور جوش و خروش سے مملو اُردو شاعری صرف ہنگامی ادب کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ بقول ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اُردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کی ایسی مدھم لے بھی موجود ہے جہاں ادب سے احتجاج اور احتجاج سے ادب کو الگ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ایسی شاعری کو آفاقی قدروں کی حامل ہے اور یہ آواز ہر عہد کی آواز ہے۔ (۷)

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب نے آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد میں اپنی آواز ہمیشہ بلند رکھی ہے اور یہ جدوجہد ہمارے ادیبوں نے صرف پاکستان کی تحریکِ آزادی کے حوالے سے ہی نہیں کی بلکہ فلسطین، کشمیر، افریقہ، چلی، عراق، بوسنیا، ویت نام، الجزائر اور افغانستان کی تحاریکِ آزادی کے ساتھ بھی جذبہ خیر سگالی کا اظہار کیا ہے۔ تراجم کے توسط سے اُردو قارئین جہاں ایک طرف دنیا بھر کے حریت پسند ادیبوں مثلاً لورکا، چی گوہرا، ناظم حکمت، بنجمن مولائس، محمود درویش اور نیرودا وغیرہ سے متعارف ہوئے ہیں وہیں جدید تراکیب، علامتی نظام، اسالیب اور لفظیات کے حوالے سے اُردو ادب کی ثروت مندی میں بھی اضافہ ہوا ہے اور یوں اُردو ادب اور آزادی کی تحاریک کے مابین استوار گہرے رشتے نے ادب کی فکری معنویت میں توسیع کی ہے۔ لیکن آزادی کے حصول کے بعد اگلا مرحلہ ادیب کا سماجی کردار متعین کرنے کا ہوتا ہے گزشتہ اکہتر سال سے شعر و ادب کا سرمایہ اس امر کی نشاندہی کے لیے کافی ہے کہ ہمارے ادیب نے اپنے عہد کے ضمیر کی حفاظت کی اور اپنے تجربوں کو دوسروں کے لیے بامعنی بنانے کی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور آج کا ادیب سمجھتا ہے کہ سر سیّد تحریک کے افادی منشور سے لے کر ترقی پسند تحریک کی شعریات تک بیرونی احکامات کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا اسے اب ختم ہونا چاہیے کیونکہ اب مسئلہ کتاب یا ادب کی بقا کا نہیں بلکہ ادب کے واسطے سے انسان کی ذہنی اور تخلیقی آزادی کا ہے۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر جمیل جالبی، ''الجزائر اور ہمارے دانشور'' مشمولہ ماہنامہ ہم قلم۔ (الجزائر کو سلام)، ص ۳۵

(۲) فیض احمد فیض، کلیاتِ فیض (دستِ حبا)، مکتبہ کارواں لاہور، ص ۱۵۵

(۳) افضل توصیف، ''محمود درویش کہ ہمارا شاعر تھا'' مشمولہ ماہنامہ اخبارِ اُردو، اسلام آباد ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۸۰

(۴) رضی عابدی، تیسری دنیا کا ادب، ص ۵۹

(۵) شمیم حنفی، اقبال اور عصرِ حاضر کا خرابہ، اکادمی بازیافت، ص ۵۹

(۶) شان الحق حقی ''نکتہ رازؔ بحوالہ خواجہ منظور حسین۔ غزل کا خارجی بہروپ، لاہور مکتبہ کارواں ۲۹۸۱، ص ۸

(۷) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم۔ مرتب اُردو ادب۔ احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ص ۱۱